شاہد حسین رزاقی

لندن مسلم لیگ

برطانیہ میں ہندوستانی مسلمانوں کی سرگرم سیاسی تنظیم

۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف تحریکِ عظیم کی ناکامی اور سلطنتِ مغلیہ کے خاتمے کی وجہ سے ہندوستان میں مسلمانوں کو انتہائی نازک حالات اور شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ سیاسی اقتدار سے محروم ہونے کے بعد ان کا معاشرتی وقار بھی گرنے لگا اور اقتصادی حالت روز بروز خراب تر ہوتی گئی۔ سن ۵۷ کی شورش عظیم کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا اور یہ کوشش کی کہ قومی حیثیت سے مسلمان بالکل تباہ و برباد ہوجائیں۔ کیونکہ انگریز مسلمانوں سے خائف تھے اور اپنی حکومت کے لیے ان کو بہت بڑا خطرہ سمجھتے تھے۔

انگریزوں کی تباہ کن پالیسی

انگریزوں کو یہ خطرہ تھا کہ مسلمان اپنی کھوئی ہوئی سلطنت حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ چنانچہ مسلمانوں کو کمزور رکھنے کے لیے انھوں نے ہندوؤں کی سرپرستی کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ یہ پالیسی مسلمانوں کے لیے اس وجہ سے اور زیادہ خطرناک تھی کہ ہندوستان میں ہندو بہت بڑی اکثریت میں تھے اور انگریز یہ چاہتے تھے کہ خود اپنے تصورِ جمہوریت اور وطنی قومیت پر مبنی اکثریت کی حکومت کے نظریہ کو ہندوستان میں بھی بتدریج روبہ عمل لائیں۔ شاہ عالم اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس میں مسلمانوں کے معاشی مفاد اور معاشرتی برتری کا تحفظ کیا گیا تھا لیکن ڈلہوزی اور بنٹنک کی پالیسی نے ایسے معاہدوں کو بالکل غیر مؤثر بنا دیا۔ مسلمان نہ صرف سرکاری عہدوں سے محروم ہوتے گئے بلکہ حصولِ معاش کے دوسرے ذرائع بھی مسدود ہونے لگے۔ اور آخر کار ان کو ایسی زبردست مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا کہ ان کا قومی وجود تک

خطرے میں پڑ گیا۔

امیر علی کی سیاسی بصیرت

اس انتہائی نازک دَور میں مسلمانوں کو خوش قسمتی سے سید احمد خاں اور سید امیر علی جیسے دو بڑے رہنما مل گئے جن کی پیہم جدوجہد سے حالات کا رخ بدل گیا۔ سرسید عظیم معاشری مصلح اور ماہر تعلیم تھے اور سید امیر علی بڑے دُور اندیش سیاست دان اور مدبر تھے اور ان کی کوششوں سے اسلامی ہند کے دورِ جدید کا آغاز ہوا۔ امیر علی غیر معمولی سیاسی فہم و بصیرت کے مالک تھے اور انیسویں صدی کے آخر ربع میں ہندوستان بھر میں صرف وہی ایک ایسے مسلمان رہنما تھے جنھوں نے مغربی افکار کا غائر مطالعہ کیا تھا اور انگریزی عہدِ حکومت میں ہندوستان کے سیاسی مستقبل کا واضح شعور رکھتے اور صحیح اندازہ کر سکتے تھے۔ انھوں نے انگلستان میں کافی وقت گذارا تھا۔ سربرآوردہ انگریزوں سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔ وہ انگریزوں کی قومی روایات، ذہنی رجحان، سیاسی نظریات اور حکمتِ عملی سے خوب واقف تھے اور تمام حالات واسباب کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندوستان میں عنقریب سیاسی جدوجہد کا آغاز ہو جائے گا اور اہل ہند کو جو سیاسی حقوق دیئے جائیں گے اور رفتہ رفتہ جو حکومتی ادارے قائم ہوں گے ان سے وہی قوم فائدہ اٹھا سکے گی جو سیاسی اعتبار سے منظم ہوگی۔

نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن

سرسید مسلمانوں کو انگریزی تعلیم دینے کے لیے بڑی جدوجہد کر رہے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ مسلمانوں کو سیاست سے بالکل الگ رکھنا چاہتے تھے اور امیر علی کا یہ خیال تھا کہ مسلمانوں کو صرف انگریزی تعلیم دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس تعلیم کے ساتھ ساتھ ان میں سیاسی شعور پیدا کرنے، ان کو سیاسی تربیت دینے اور حکومت کے سامنے ان کے مطالبات مؤثر طور سے پیش کرنے کے لیے ایک ایسی ملک گیر سیاسی تنظیم قائم کرنا بھی ضروری ہے جو مسلمانوں کی نمایندہ قومی تنظیم ہو اور جس کی شاخیں تمام صوبوں، ضلعوں اور مختلف مقامات میں قائم ہوں۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کی قومی سیاسی تنظیم کی ضرورت پر سرسید کو متوجہ کیا اور ان کی امداد چاہی لیکن انھوں نے اس تجویز سے اختلاف کیا۔ کیونکہ ان کو یہ اندیشہ تھا کہ اس طرح انگریز مسلمانوں کی طرف سے بدگمان ہو جائیں گے۔

اور ان کی ناراضگی مسلمانوں کے لیے تباہ کن ہوگی۔ مگر امیر علی اپنی رائے پہ قائم رہے اور ۱۸۷۷ء میں نیشنل محمڈن اسوسی ایشن کے نام سے ایک جماعت قائم کردی۔ جس کی شاخیں ہندوستان بھر میں پھیل گئیں یہ ہندوستان میں مسلمانوں کی پہلی قومی تنظیم تھی جو انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے بھی آٹھ نو سال پہلے قائم ہوئی تھی۔ امیر علی اس کے سکریٹری ہوئے اور پچیس سال تک یہ فرض انجام دیتے رہے۔

کل ہند مسلم لیگ

۱۹۰۴ء میں امیر علی نے انگلستان میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ہندوستان میں کوئی مسلمان رہنما ان کی جگہ نہ لے سکا اور محمڈن اسوسی ایشن رفتہ رفتہ ختم ہوگئی۔ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے امیر علی نے اپنی جد و جہد انگلستان میں بھی جاری رکھی۔ وہ برطانوی قوم اور ارباب حکومت پر اس حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ ہندوستان کبھی ایک ملک نہیں رہا۔ انگریزوں نے اس کو ایک سلطنت تو بنا دیا ہے لیکن ایک ملک نہیں بنا سکتے۔ انگریزوں کی اس وسیع سلطنت میں مختلف قومیں آباد ہیں۔ جن میں مسلمان اور ہندو سب سے بڑی قومیں ہیں۔ ہندو تعداد کے لحاظ سے زیادہ ہیں لیکن تاریخی اور سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کی زیادہ اہمیت ہے اور ہندوستان میں وہی واحد قوم ہیں جن کو قومیت کے صحیح مفہوم میں ایک قوم کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں دستوری اصلاحات کو کامیاب بنانے اور اہلِ ہند کو منصفانہ طور پہ سیاسی حقوق دینے کے لیے یہ لازمی ہے کہ مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب و نیابت کا حق دیا جائے۔ امیر علی کی ان کوششوں کا خاطر خواہ اثر ہوا اور ہندوستان کے مسلمان رہنما بھی متوقع دستوری اصلاحات کے تحت قائم ہونے والے نظامِ حکومت میں اپنے سیاسی حقوق کی حفاظت کرنے اور حکومتِ ہند اور حکومتِ برطانیہ کے سامنے اپنے مطالبات مؤثر طور پر پیش کرنے کے لیے مسلمانوں کی ایک ملک گیر سیاسی تنظیم قائم کرنے پر متوجہ ہوئے۔ یہ سیاسی بیداری اور جد و جہد کا نہایت اہم دَور تھا۔ مسلمان رہنماؤں کی کوششیں بار آور ہوئیں اور دسمبر ۱۹۰۶ء میں کل ہند مسلم لیگ قائم کردی گئی۔

لندن مسلم لیگ کا قیام اور امیر علی کی قیادت

جب کل ہند مسلم لیگ قائم ہوئی تو ہندوستان میں دستوری اصلاحات نافذ کرنے کا منصوبہ

پر غور تھا اور مسلمان اس بات پر متفق تھے کہ ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے جداگانہ انتخاب اور نمایندگی کا اصول اختیار کرنا نہایت ضروری ہے۔ اسی مقصد کے تحت ۱۹۰۹ء میں آغا خاں کی قیادت میں مسلمانوں کا ایک وفد وائسرائے ہند لارڈ منٹو سے ملا تھا اور اپنے مطالبات پیش کیے تھے۔ وفد نے مسلمانوں کے لیے جداگانہ حق انتخاب و نمائندگی کی ضرورت و اہمیت پر زور دیا تھا اور وائسرائے نے اس مطالبہ سے اتفاق کر لیا تھا۔ اصلاحات نافذ کرنے کا منصوبہ جوں جوں آگے بڑھتا گیا سیاسی سرگرمیاں تیز تر ہوتی گئیں۔ اور یہ ضروری سمجھا گیا کہ برطانیہ میں حکومت اور عوام کے سامنے مسلمانوں کا نقطۂ نظر واضح کرنے اور ان کے سیاسی حقوق تسلیم کرانے کے لیے لندن میں بھی مسلم لیگ کی شاخ قائم کی جائے۔ اس وقت امیر علی انگلستان میں مقیم تھے اور ان کا بھی یہی خیال تھا کہ مسلمانوں کے سیاسی اور آئینی حقوق کی جدوجہد کو مؤثر طور پر جاری رکھنے اور خاطر خواہ نتائج حاصل کرنے کے لیے لندن میں ہندوستانی مسلمانوں کی ایک نمائندہ تنظیم کا قیام لازمی ہے۔ چنانچہ انھوں نے ۶ مئی ۱۹۰۸ء کو لندن مسلم لیگ قائم کر دی اور وہی اس کے صدر بنائے گئے۔ یہ ایک دانش مندانہ اقدام تھا اور آیندہ چند سال کے دوران میں امیر علی کی رہنمائی میں لندن مسلم لیگ نے مسلمانوں کے حقوق و تحفظ کے لیے جو کامیاب جدوجہد کی وہ اسلامیانِ ہند کی سیاسی بیداری اور ملی تحریک کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔

بنیادی مقاصد

لندن مسلم لیگ قائم کرنے کے لیے ۶ مئی ۱۹۰۸ء کو کیکسٹن ہال لندن میں ایک بڑا اجتماع ہوا جس میں نہ صرف مسلمان بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والے انگریز بھی شامل ہوئے۔ نو قائم شدہ تنظیم کے دستور میں اس کے مقاصد کی وضاحت کی گئی اور یہ بیان کیا گیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی اس جماعت کا قیام ایک تعمیری اقدام ہے اور اس کے اہم مقاصد یہ ہیں:-

۱۔ ہندوستان کی مختلف قوموں میں اتحاد و تعاون کو فروغ دینا۔

۲۔ ہندوستان کی دوسری قوموں کے تعاون اور صلاح مشورہ سے ملک کے عام مفاد کی ترقی کے لیے کام کرنا۔

۳ - ہندوستانی مسلمانوں کے خصوصی مفادات کو مخلصانہ طور پر پیش کرنا اور تمام آئینی طریقوں سے ان کا تحفظ کرنا۔

۴ - برطانیہ کے سربرآوردہ اہلِ فکر کو ہندوستانی مسلمانوں کے حالات سے باخبر رکھنا۔

اپنے ان مقاصد کے مطابق لندن مسلم لیگ ۱۹۰۸ سے ۱۹۱۳ تک امیر علی کی رہنمائی میں سرگرم عمل رہی۔ اس کی کوشش یہ رہی کہ دوسری قوموں کو نقصان پہنچائے بغیر مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی جائے۔ ہندوستان کے صحیح حالات سے اہلِ انگلستان کو باخبر کر کے مسلمانوں کے مسائل کی وضاحت کی جائے اور ان کے حقوق و مطالبات تسلیم کرنے میں جو رکاوٹیں ہوں ان کو مؤثر اور معقول تدبیروں سے دُور کیا جائے۔

تاسیسی اجتماع میں مقاصد کی وضاحت

لندن مسلم لیگ کے تاسیسی اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے امیر علی نے یہ واضح کر دیا کہ اس جماعت کے قیام کا مقصد فرقہ پرستی نہیں ہے بلکہ مسلمان تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی مختلف اقوام کے درمیان ہم آہنگی کو فروغ حاصل ہو اور وہ ملک کی بہتری اور مفادِ عامہ کی ترقی کے لیے کام کریں اور اس مقصد کے لیے وہ ملک کے تمام فرقوں اور طبقوں سے تعاون کرنے پر آمادہ ہیں لیکن ملک کی فلاح و بہبود اور اپنے مفاد کی حفاظت کے لیے وہ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اجتماعی حیثیت سے وہ منظم اور متحد ہو جائیں۔

مسلمانوں کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے امیر علی نے کہا کہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملک کے نظم و نسق میں مسلمانوں کا حصہ محض برائے نام ہے اور ترقی کے میدان میں وہ بہت پیچھے ہیں۔ اب تک مسلمان ترقی پسند تحریکوں سے پوری طرح فائدہ کیوں نہیں اٹھا سکے یا حکومت سے اپنے جائز حقوق کیوں نہ حاصل کر سکے۔ اس کے مختلف اسباب ہیں جن میں پہلا سبب یہ ہے کہ وہ جدید علوم اور انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ گذشتہ پچھتر سال کے دوران میں مسلمان زوال و انتشار کا شکار ہوتے اور رفتہ رفتہ اس میں اتنا اضافہ ہو گیا کہ ان کی قومی وحدت شکست ہو گئی اور وہ چھوٹے چھوٹے گروہوں اور جماعتوں میں بٹ گئے اور ان کے مقاصد اور عزائم میں بھی شدید اختلاف پیدا ہو گیا۔ گذشتہ چند سال کے دوران میں ہندوستان

میں بہت اہم تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور مسلمانوں نے بھی آخر کار اس حقیقت کو محسوس کر لیا ہے کہ وہ اجتماعی طور پر اور متحد ہو کر ہی اپنے مقاصد اور حقوق حاصل کر سکتے ہیں۔ کل ہند مسلم لیگ کا قیام اسی حقیقت کے احساس کا نتیجہ ہے۔

کل ہند مسلم لیگ اور برطانیہ میں اس کی ترجمان لندن مسلم لیگ کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے امیر علی نے کہا کہ مسلم لیگ کا مقصد یہ ہے کہ وہ تمام آئینی ذریعوں سے ہندوستانی مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کرے اور ان کی فلاح و بہبود کی تدبیریں اختیار کرے۔ مسلمان ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ وہ دوسری قوموں کا حق ماریں یا ان کے جذبات کو مجروح کریں بلکہ ہندوستان کی دوسری قوموں کی طرح مسلمان بھی یہ چاہتے ہیں کہ نظام حکومت میں اصلاح و ترقی ہو۔ اس میں اہل ملک کو زیادہ حصہ دیا جائے۔ حاکموں اور رعایا میں ہمدردی و تعاون کا جذبہ بڑھے اور مشرقی اور مغربی اقوام کے درمیان تعلقات خوشگوار رہیں۔ نمایندہ اداروں کو ترقی ہو اور نظم و نسق کے مختلف شعبوں میں اصلاحات کی جائیں لیکن اس کے ساتھ ہی اس واضح حقیقت کو ملحوظ رکھنا بھی لازمی ہے کہ مسلمانوں کے خود اپنے مخصوص مفادات بھی ہیں جن کو حاصل کرنے کے لیے خود اپنی تنظیم کا ہونا ضروری ہے اور اسی بنا پر ہم نے یہ تنظیم قائم کی ہے۔

مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی وضاحت

لندن مسلم لیگ اپنے مقاصد کے مطابق سرگرم عمل ہو گئی تھی اور متوقع آئینی اصلاحات کے پیش نظر مسلمانوں کے مفادات و مطالبات کے حصول کے لیے ممکنہ جد و جہد کر رہی تھی۔ برطا[نیہ] کے سیاستدانوں اور دانشوروں کو ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سے آگاہ کرنا اور ان سے ر[ابطہ] قائم رکھنا بھی لندن مسلم لیگ کا ایک اہم مقصد تھا۔ چنانچہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۸ء کو ہندوستانی مسلمانو[ں کے] ہمدرد اور بہی خواہ انگریزوں کو لیگ کی طرف سے ویسٹ منسٹر پیلس ہوٹل میں مدعو کیا گیا۔ امیر[علی] اس تقریب کے صدر تھے اور انھوں نے اپنی تقریر میں یہ واضح کیا کہ اس اجتماع کا مقصد انگلست[ان] کے سربرآوردہ سیاست دانوں کو ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل اور نقطۂ نظر سے آگاہ کرنا ہ[ے] تاکہ انگلستان کے باشندے ہندوستان کی اس قوم سے بہتر طور پر واقف ہو سکیں اور اس[کے] مسائل سے دلچسپی لینے لگیں جو تعداد میں سات کروڑ کے قریب ہے اور تاریخی و سیاسی اعت[بار]

سے ایک ممتاز حیثیت کی حامل ہے۔

مسلمانوں کا مذہب اور ان کی قومی روایات ہندوستان کی دوسری قوموں سے بالکل مختلف ہیں اور ان کے مفادات ہندوستان کے دوسرے باشندوں کے مفادات کے مماثل نہیں ہوسکتے چنانچہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے یہ امر ناگزیر ہے کہ وہ اپنی صلاح وفلاح کے لیے باہم متحد ہوکر پرجوش جدوجہد کریں۔ اگرچہ ان کی یہ خواہش ہے کہ ہندوستان کے وسیع تر مفاد کے لیے وہ ملک کے دوسرے خیر خواہ عناصر کے ساتھ پورا تعاون کریں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ اس ملک میں ان کی ایک الگ اور امتیازی حیثیت بھی ہے اور اس کا تحفظ کرنا نہایت ضروری ہے۔

مسلمانوں کا یہ خیال ہے کہ ملک کی ترقی کے لیے ہندوستانی عوام اور سرکاری عہدہ داروں میں تعاون بہت ضروری ہے اور ان کو اس ضرورت کا بھی بخوبی احساس ہے کہ اہل ہند کے جائز مطالبات سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے نظم ونسق کے مختلف شعبوں میں اصلاح کی جائے۔ لیکن کی ترقی کے لیے وہ محض سیاسی اصلاحات کو کافی نہیں سمجھتے اور ان کا یہ خیال ہے کہ تعلیم کا فروغ، ملک کے مختلف علاقوں کی یکساں ترقی اور نظامِ عدلیہ کی اصلاح بھی ایسے ہی ضروری اور اہم مسائل ہیں جیسے کہ قانون ساز کونسلوں اور مقامی اداروں میں اہلِ ہند کو زیادہ نمائندگی دینے کا مسئلہ۔ ان امور کے علاوہ مسلمانوں کے اپنے مخصوص مسائل اور ضروریات بھی ہیں اور ان میں ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ مسلمان خاندانوں کو انتشار اور افلاس سے بچایا جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حکومتِ برطانیہ اور حکومتِ ہند کو اس طرف متوجہ کرنا ضروری ہے کہ مسلمانوں کی املاک کو جو بری طرح ضائع ہو رہی ہے محفوظ رکھا جائے اور اس سرمایہ سے ان کے لیے جدید تعلیم کا معقول انتظام کیا جائے جو موجودہ زمانہ کے حالات کے پیشِ نظر نہایت ضروری ہے۔

امیر علی نے اس بات پر خاص طور سے زور دیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے حقوق ومفاد کے تحفظ کے لیے ان کا یہ مطالبہ بہت اہم ہے کہ تمام نمائندہ اداروں میں جو ہندوستان میں عنقریب قائم کیے جائیں گے مسلمانوں کو مؤثر ومعقول نمائندگی اور اپنے نمائندے خود منتخب کرنے کا حق دیا جائے۔ نیز سرکاری ملازمتوں میں بھی ان کو زیادہ حصہ ملے۔

لارڈ مورلے کا خیالِ خام

جداگانہ حقِ انتخاب ونمائندگی کے بارے میں ہندوستانی مسلمانوں کے مطالبات سے لارڈ منٹو

وائسرائے ہند نے اتفاق کر لیا تھا اور وزیر ہند کو بھی یہ مشورہ دیا تھا کہ مجوزہ دستوری اصلاحات میں مسلمانوں کو وہ حقوق و مراعات دی جائیں جو ان کی تاریخی اور سیاسی اہمیت کے شایانِ شان ہوں۔ لیکن وزیر ہند لارڈ مورلے اس سے متفق نہ تھا۔ وہ ہندوستان کے حالات سے بالکل ناواقف تھا اور اس خام خیالی میں مبتلا تھا کہ وہ ہندوستان میں برطانوی جمہوری نظام کے مطابق مخلوط طریقِ انتخاب اور اکثریت کی حکومت کا اصول نافذ کر کے ہندوستان کو ایک متحدہ ملک اور اہل ہند کو ایک قوم بنا دے گا چنانچہ اس نے یہ کوشش کی کہ مجوزہ اصلاحات کے منصوبے میں مسلمانوں کی جداگانہ نمائندگی کا طریقہ ختم کر دیا جائے اور طریقِ انتخاب ایسا رکھا جائے کہ مسلمان اور ہندو دونوں قومیں اپنے نمائندے مشترک طور پر منتخب کر لیں۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان صحیح اور مؤثر نمائندگی اور اپنے نمائندے خود منتخب کرنے کے حق سے محروم ہو جائیں اور دائمی ہندو اکثریت کا اقتدار ہمیشہ قائم رہے۔

مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمی کا ازالہ

مسلمانوں کے لیے مورلے کی یہ تجاویز قطعی طور پر ناقابل قبول تھیں اور مسلم لیگ نے اس کی شدید مخالفت کی۔ مسلمانوں کے مخالف عناصر نے دستوری اصلاحات کے بارے میں مسلمانوں کی روش اور ان کے مطالبات کے خلاف انگلستان میں پروپیگنڈہ شروع کر دیا جس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ ہندوستان کے مسلمان آئینی اصلاحات کے مخالف ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ہندو اکثریت کے جائز حقوق سلب کر کے ان کو ناجائز مراعات دی جائیں۔ اس غلط فہمی کو دُور کرنے کے لیے امیر علی نے لندن کے اخبار ٹائمز کے نام ایک تفصیلی خط میں جو ۴ جنوری ۱۹۰۹ء کو شائع ہوا تھا، مسلمانوں کا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے لکھا کہ مجوزہ اصلاحات کے مطابق اہل ہند کو جو سیاسی مراعات دی جانے والی ہیں ان کو ہندوستان کی دوسری قوموں کی طرح مسلمان بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ دستوری تجاویز کے عملی نفاذ میں ان کے حقوق و مفاد کو نظر انداز نہ کیا جائے ورنہ اصلاحات کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ مسلمان ان تجاویز میں ایسی ترمیم کرانا چاہتے ہیں جس سے ان کے مفاد کی حفاظت ہو سکے ورنہ وہ نہ تو ناجائز مراعات کے طلبگار ہیں اور نہ دوسروں کے جائز حقوق چھین لینے کے خواہاں ہیں۔ ان کا مطالبہ صرف یہی ہے کہ قانون ساز کونسلوں اور دوسرے نمائندہ اداروں میں ان کی نمائندگی محض نمائشی نہ ہو بلکہ حقیقی اور مؤثر ہو۔ مسلمان

کے لیے تو پوری طرح آمادہ ہیں کہ دوسری قوموں سے اشتراک و تعاون کریں مگر یہ گوارا نہیں کر سکتے
ثریت ان کو اپنا محکوم بنائے رکھے۔

متحدہ قومیت کے مفروضہ کو غلط قرار دیتے ہوئے امیر علی نے یہ واضح کیا کہ ہندوستان کے
مانوں اور ہندوؤں میں زندگی کے ہر شعبہ میں زبردست اختلاف پایا جاتا ہے، مذہب، روایات
م و رواج اور رہن سہن غرض کہ ہر اعتبار سے یہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ہندو یہ چاہتے
کہ انگریزوں کے عہد میں ان کو جو برتری حاصل ہوگئی ہے وہ قائم رہے اور مسلمان کوشاں ہیں کہ وہ
ے حقوق حاصل کر لیں۔ ان دونوں قوموں کے شدید اختلافات اور موجودہ حالات کو نظر انداز کر کے
رپورٹ ہند کی سفارش کے مطابق اگر مخلوط طریق انتخاب نافذ کیا گیا تو اس کا نتیجہ مستقل کش مکش شدید
بت اور باہمی رنجش کی شکل میں نکلے گا۔ اس طرح مسلمان مؤثر نمائندگی سے محروم رہیں گے۔ پورے انتخابی
ام پر ہندوؤں کا قبضہ ہو جائے گا اور صرف وہی مسلمان منتخب ہو سکیں گے جو ہندوؤں کے لیے
قبول ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو مخلوط انتخاب پر اصرار کر رہے ہیں اور مسلمانوں کے لیے جداگانہ
انتخاب کے مخالف ہیں۔

اس ضمن میں یہ ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ دونوں قوموں کی اقتصادی حالت میں بھی بڑا فرق ہو
ہے۔ مسلمانوں میں کوئی ساہوکار، مہاجن یا بنیا نہیں ہوتا۔ وکالت اور دوسرے پیشوں میں بھی ان
تعداد ہندوؤں کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔ سرکاری ملازمتوں میں بھی مسلمان بہت تھوڑے
ے ہیں۔ اس طرح حق رائے دہی کے قواعد کے مطابق مسلمان رائے دہندوں کی تعداد اتنی کم ہوگی کہ
سلمانوں کی نمائندگی بالکل غیر مؤثر ہو جائے گی اور جو مسلمان کلی یا جزوی طور پر ہندوؤں کے ووٹوں سے
منتخب ہوگا۔ وہ کلی یا جزوی طور پر اپنے سیاسی حامیوں کا ہم خیال بھی ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ تناسبی نمائندگی اس مشکل مسئلہ کا ایک آسان حل معلوم ہوتی ہے لیکن یہ
سلمانوں کے حق میں نقصان رساں ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے بہت
یادہ ہے لیکن یہ زیادتی عظیم اکثریت اس لیے معلوم ہوتی ہے کہ اس میں وہ اچھوت بھی شمار کر لیے گئے
ہیں جن کا سایہ تک اصلی ہندو کو نجس بنا دیتا ہے اور جن سے وہ کسی قسم کا معاشرتی تعلق نہیں رکھتے، اور
اچھوتوں کو ہندوؤں میں محض اس لیے شمار کیا جاتا ہے کہ مردم شماری میں ہندوؤں کی تعداد بڑھ

جائے۔ چنڈال، چمار، بھنگی اور دوسری پست اقوام کبھی یہ توقع نہیں کر سکتیں کہ ہندو معاشرہ میں ان کا درجہ بڑھ جائے گا اور وہ کسی مجلس میں اصلی ہندوؤں کے دوش بدوش بیٹھ سکیں گے۔ ان بیچاروں کو تو لارڈ مورلے کی اسکیم کا پتہ تک نہیں چلے گا اور نہ وہ اس سے کبھی کوئی فائدہ اٹھا سکیں گے۔

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ تئیس لاکھ ہے۔ یہ غیر مساوی طور پر سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مختلف صوبوں اور علاقوں میں ان کی مالی حالت اور معاشرتی کیفیت مختلف ہے۔ صرف پنجاب ایک ایسا صوبہ ہے جہاں وہ مختلف شعبوں میں ہندوؤں کے ہم پلہ ہیں اور تناسبی انتخاب سے ان کو نقصان نہیں پہنچے گا، ورنہ دوسرے تمام صوبوں اور بالخصوص صوبجات متحدہ میں اگر محض تعداد کی بنیاد پر سیاسی حقوق دیئے گئے تو یہ مسلمانوں سے شدید بے انصافی ہوگی۔ صوبجات متحدہ میں تو خود گورنروں نے بھی یہ اعتراف کیا ہے کہ مسلمانوں کا معاشرتی مرتبہ ان کی تعداد کے مقابلے میں بہت زیادہ بلند ہے۔ اور یہ ان لوگوں کی اولاد ہیں جو مسلمانوں کے عہد حکومت میں اچھے عہدوں پر فائز تھے۔ ظاہر ہے کہ تعداد کی بنیاد پر سیاسی حقوق ان کی یہ حیثیت ختم کر دیں گے۔ مسلمانوں کی نمائندگی اسی وقت بامعنی ہوسکتی ہے جب وہ موثر اور معقول ہو اور کونسلوں میں ان کی رائے وزن دار ہو اور اس کی اہمیت اس لیے اور زیادہ ہے کہ وزیر ہند نے یہ طے کیا ہے کہ صوبائی کونسلوں میں غیر سرکاری ارکان کی اکثریت ہوگی۔

وزیر ہند سے مسلم لیگی وفد کی ملاقات اور عرضداشت

اخبار ٹائمز میں اس بیان کی اشاعت کے بعد وزیر ہند مورلے نے امیر علی کو ملاقات کی دعوت دی۔ امیر علی جب ملنے گئے تو بہت سے تار اور خطوط بھی لے گئے جو ہندوستان سے مسلمانوں کے حقوق و مطالبات کی حمایت میں موصول ہوئے تھے۔ مورلے نے ان کو غور سے پڑھنے کا وعدہ کیا۔ دستوری اصلاحات اور مسلمانوں کے حقوق کے مسئلہ پر دونوں میں دیر تک گفتگو ہوتی رہی اور امیر علی نے یہ واضح کر دیا کہ اگر اصلاحات میں مسلمانوں کی مساوی شرکت کا حق تسلیم کر لیا جائے تو وہ اصلاحات کی مخالفت نہیں کریں گے۔

۲۷ جنوری ۱۹۰۹ کو لندن مسلم لیگ کا ایک وفد جس کے قائد امیر علی تھے۔ لارڈ مورلے سے ملا اور دستوری اصلاحات کی مجوزہ اسکیم پر مسلمانوں کو جو اعتراضات تھے وہ ایک عرضداشت کی شکل میں پیش

کیے۔ اس عرضداشت میں وضاحت کے ساتھ یہ بیان کیا گیا تھا کہ ہندوستانی مسلمان مجوزہ دستوری اصلاحات کے عام رجحان اور حوصلہ افزا امور کی قدر اور تائید کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ بعض ایسی تجاویز کو انتہائی تشویش اور شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں جن سے مسلمانوں کے مفادات کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔ اس لیے وفد نے یہ ضروری خیال کیا کہ وہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو اس عرضداشت میں واضح طور پر پیش کرے۔

"مسلمان قوم کا یہ مطالبہ کہ مرکز اور صوبوں کی قانون ساز کونسلوں میں مسلمانوں کو ایسی معقول اور مؤثر نمائندگی دی جائے جو ان کی تعداد اور ان کی سیاسی و تاریخی اہمیت کے شایانِ شان ہو، ایسا مطالبہ ہے جس کو حکومتِ ہند نے بھی اپنے گشتی مراسلہ مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۰۷ء اور مکتوب بنام وزیرِ ہند مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۰۸ء میں تسلیم کیا ہے اور اس کی پُرزور سفارش کی ہے۔ حکومتِ ہند نے اپنے مذکورۂ بالا گشتی مراسلہ میں اس امر پر بھی توجہ دلائی ہے کہ انتخابات کا جو طریقہ اب تک نافذ رہا ہے اس کے مطابق تقریباً تمام حلقوں میں ہندوؤں کی بڑی اکثریت ہوتی ہے اس لیے صرف چند مسلمان منتخب ہو سکتے ہیں۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے حکومت مسلمانوں کو نامزد کرتی ہے۔ لیکن یہ مجموعی تعداد بھی مسلمانوں کی اس اہمیت کے مطابق نہیں ہوتی جس کے وہ مستحق ہیں۔ مزید براں اس مراسلہ میں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ نامزدگی کا طریقہ اس طبقہ کے مسلمانوں کو نامزد کرنے میں ناکام ہوا ہے جس کو مسلمان اپنا نمائندہ بنانے کے خواہشمند ہیں۔

"وزیرِ ہند نے اپنے مراسلہ مؤرخہ ۲۷ نومبر ۱۹۰۸ء کے فقرہ ۹ میں حکومت ہند کی اس رائے سے پورا اتفاق کیا ہے کہ وسیع تر کونسلوں میں مسلمانوں کو معقول نمایندگی دی جائے۔ اس کے ساتھ ہی وزیرِ ہند نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ قانون ساز کونسلیں مجموعی طور پر آبادی کے اہم عناصر کا عکس ہوں۔ نیز یہ کہ نمایندگی کا کوئی ایسا طریقہ اطمینان بخش نہیں ہو سکتا جس میں مسلمانوں اور زمینداروں جیسے اہم طبقوں کو کونسلوں میں نمایندگی نہ دی جائے۔

"وفد کے اراکین یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ تمام مسلمان وزیرِ ہند کی ان تجاویز کو انتہائی تشویش کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ جن کے نتیجے میں مسلم قوم کی نمایندگی اور اس کے مفادات کا انحصار ایک مخالف قوم کے رحم و کرم پر ہو۔

"ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ باہمی تعاون کا جذبہ اتنی ترقی کر جائے اور مختلف قوموں میں میل جول اس قدر بڑھ جائے کہ ہندوستان کی کسی قوم کے مفاد کو قربان کیے یا ایک قوم کو نقصان پہنچائے دوسری

کو ترجیح دیئے بغیر وزیر ہند کے بیان کردہ اصولوں کو عملی شکل دینا ممکن ہو سکے لیکن موجودہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ملک دستوری اصلاحات کے لیے خواہ کتنا ہی تیار کیوں نہ ہو ہندوستان کی دو بڑی قوموں مسلمانوں اور ہندوؤں کے مفادات کو لازمی طور پر پیش نظر رکھا جائے اور ان کے جداگانہ تحفظ کا انتظام کیا جائے۔

"اس مقصد کے پیش نظر کہ مسلمانوں کی نمائندگی حقیقی ہو اور محض رسمی و نمائشی نہ ہو، یہ لازمی ہے کہ مسلمان نمائندے اپنی قوم کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کریں اور ایسی پالیسی کی حمایت کریں، جس کی خود ان کی قوم کے ذہین ترین افراد ستائش کر سکیں۔ ایک ایسے انتخابی نظام میں جس کا حلقۂ انتخاب ۷۵ ہندوؤں اور ۲۵ مسلمانوں پر مشتمل ہو جو مسلمان منتخب ہو سکے گا وہ اکثریت کا محض نامزد شدہ ہوگا۔ مزید برآں ایسے مقامات میں جہاں مہاجنوں اور وکیلوں کے با اثر طبقے ہوں گے وہاں بہر صورت انتخابات ان مسلمان امیدواروں کے حق میں ہوں گے جن کے نظریات خود ان کی قوم کے لیے ناقابلِ قبول ہیں اور مخلوط انتخاب کی صورت میں تو یہ تکلیف دہ صورتِ حال اور زیادہ خراب ہو جائے گی۔

"ایک بیان میں یہ کہا گیا ہے کہ مخلوط انتخاب کے بارے میں مسلمانوں کے خدشات بے بنیاد ہیں کیونکہ اگر ایک مسلمان امیدوار مسلمان رائے دہندوں کی مجموعی آرا سے منتخب ہو اور دوسرا امیدوار اکثریت والی قوم کے ووٹ حاصل کرلے تو بجائے ایک کے دو مسلمان منتخب ہو جائیں گے۔ اس استدلال کا مقصد خواہ کچھ بھی ہو، وزیر ہند کے مراسلہ کی عبارت میں اس کی کوئی سند نہیں۔ اس کے سیاق و سباق پر غور کرنے سے تو یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ایک مسلمان نمائندہ جو ہندوؤں کے پورے ووٹ حاصل کرلے یا کچھ ووٹ ہندوؤں کے اور کچھ مسلمانوں کے حاصل کر سکے اس امیدوار کو ناکام بنا دے گا جس کا انحصار صرف مسلمانوں کے ووٹوں پر ہوگا۔

"اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ مذکورہ بالا استدلال درست ہے تب بھی یہ مسلمانوں کے لیے بہت خطرناک ہے۔ ایک ایسا شخص جو ہندوؤں کا نامزد کردہ ہو اور جس کا دعویٰ تو یہ ہو کہ وہ مسلمانوں کا نمائندہ ہے لیکن جو اپنی قوم کے جذبات و احساسات اور آرا سے ناواقف ہو درحقیقت ایک مستقل کشمکش کا سبب بن جائے گا۔ انتخابی حلقوں سے جن فوائد کی توقع رکھی جاتی ہے وہ حاصل نہ ہو سکیں گے اور شکایتوں اور رنجشوں میں اضافہ ہو جائے گا۔

"وفد کو یقین ہے کہ اگر مسلمان اپنے لیے دوہرے ووٹ کا جائز اور منصفانہ مطالبہ کریں تو ملک معظم کی حکومت محض اس لیے مزاحمت نہ کرے گی کہ آبادی کے بعض خود غرض عناصر ناراض ہو جائیں گے اگر مسلمانوں کو کونسلوں، دیہی اور ضلعی بورڈوں اور کارپوریشنوں میں معقول اور مؤثر جداگانہ نمایندگی اور اپنے نمایندے منتخب کرنے کا حق حاصل رہے تو وہ یونیورسٹی کی نمایندگی کے سوا جہاں دونوں قوموں کو دوہرے ووٹ کی رعایت حاصل ہے کہیں اور دوہرے حق رائے دہی کا مطالبہ نہیں کریں گے۔ اگر ان اصولوں کے مطابق مسلمانوں کو نمایندگی دی جائے تو محض نمائیشی نمائندگی کے برعکس یہ طریقہ دونوں قوموں کے نمایندوں میں تعاون و ہم آہنگی پیدا کرنے کا ذریعہ ثابت ہوگا کیونکہ اس شکل میں اکثریت مسلمانوں سے مفاہمت اور ان کی رائے کا احترام کرنے پر زیادہ مائل ہوگی بمقابلہ اس صورت کے جب کہ وہ ان کو نظر انداز کر دینے کے موقف میں ہو۔

"ہندوستان کے مسلمان نہ تو کسی قسم کا نسلی تعصب رکھتے ہیں اور نہ خصوصی مراعات کے خواہش مند ہیں۔ وہ ملک کے مفاد کی ترقی کے لیے ملک معظم کی رعایا کے تمام خیر خواہ طبقوں سے پرخلوص تعاون کرنے کے آرزو مند ہیں لیکن وہ ان اختلافات کو نظر انداز نہیں کر سکتے جو ہندوستان کی مختلف قوموں کو تقسیم کیے ہوئے ہیں۔"

مسلمان اقلیت نہیں، ایک الگ قوم ہیں

مسلمانوں کی سیاسی و تاریخی اہمیت کے علاوہ ان کی جُداگانہ قومیت کے بارے میں یہ بھی واضح کیا گیا کہ مسلمان قوم کی حمایت برطانوی سلطنت کے لیے ایک قابلِ لحاظ قوت ہے۔ برطانوی ہند کے مسلمانوں کو جن کی تعداد پانچ کروڑ ۳۰ لاکھ ہے کسی طرح بھی ایک اقلیت نہیں کہا جا سکتا اور نہ ان کی حیثیت کو ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی قوموں کے مماثل سمجھا جا سکتا ہے۔ اگرچہ وہ اس ملک میں غیر مسلموں کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں مگر وہ ایک جُداگانہ قوم ہیں اور اپنے نظریات، مذہب اور قومی روایات کے اعتبار سے دوسری قوموں سے مختلف ہیں۔ ہم وطن قوم کے کچھ لوگ ان کی موجودگی کو خواہ کتنا ہی ناپسند کیوں نہ کریں، ملکی نظم و نسق کے لیے ان کی اہمیت بہر حال مسلمہ ہے۔

"مغربی یورپ میں جہاں کے باشندے متجانس ہیں اور مشترک نظریات و احساسات نے ان میں بڑی ہم آہنگی پیدا کر دی ہے، تناسبی نمائندگی کا اصول خواہ کیسا ہی قابلِ قدر کیوں نہ ہو ہندوستان

جیسے ملک میں جہاں زندگی کے ہر شعبہ میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں یہ اصول بالکل غیر موزوں ہے۔ یہاں تو یہ کیفیت ہے کہ جو چیز ایک قوم کے مذہب کا جز ہے دوسری قوم اس سے نفرت کرتی ہے اور بعض مقامات میں تو دوسرے مذہب والے کو چھو لینا بھی نجس بنا دیتا ہے۔

"ہم نہایت پُر زور طریقے پر یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ مسلمان کوئی ایسا مطالبہ نہیں کرتے ہیں جس سے کسی قوم یا طبقہ کے جائز حقوق پامال ہوں بلکہ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان کے جائز مطالبوں کو معقول اور منصفانہ طور پر تسلیم کر لیا جائے تاکہ وہ سرکاری کونسلوں میں وہ درجہ حاصل کر سکیں جو ان کی تعداد اور سیاسی مرتبہ کے مطابق ہو۔ وہ جذبۂ مفاہمت، تعاون اور ہم آہنگی کے ساتھ ہندوؤں سے مل جل کر کام کرنا چاہتے ہیں لیکن ہندوستان کی کسی قوم یا کسی طبقے کی ماتحتی قبول کر لینے یا اکثریت کی من مانی کسی پالیسی کو تسلیم کرنے پر ہرگز تیار نہیں ہیں۔"

مسلم لیگ کی یہ عرض داشت پیش کرتے ہوئے امیر علی نے ایک تقریر بھی کی جس میں دستوری اصلاحات کے بارے میں مسلمانوں کے نقطۂ نظر، پست اقوام کو جو ہندو نہیں ہیں ہندوؤں میں شمار کرنے کی غلط پالیسی کے غیر جمہوری نتائج، مخلوط انتخاب اور تناسبی نمائندگی کے نقصانات، مسلمانوں کو قومی نمائندگی دینے کے مطالبے کی اہمیت اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ مقرر کرنے کی ضرورت واضح کرتے ہوئے یہ توقع ظاہر کی گئی تھی کہ وزیر ہند ان مسائل پر پوری طرح غور کریں گے اور مسلمانوں کے حقوق و مفاد کا تحفظ کیا جائے۔

وزیر ہند کا جواب

وزیر ہند لارڈ مورلے نے اس عرض داشت اور تقریر کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ "میرے لئے یہ دونوں چیزیں حوصلہ افزا ہیں کیونکہ چند روز قبل تک میرا یہ خیال تھا کہ مسلمان مجوزہ دستوری اصلاحات کے مخالف ہیں لیکن یہ جان کر اطمینان ہوا کہ مسلمان اصلاحات کے تو حامی ہیں مگر یہ چاہتے ہیں کہ ایسے انتخابی حلقے بنائے جائیں جو صرف مسلمانوں پر مشتمل ہوں اور ان کی تفصیلات انتظامی عہدہ دار طے کریں۔ در اصل یہ میری اس تجویز کے دائرے سے باہر نہیں جو میں نے اپنے مراسلے میں پیش کی ہے اب اس پر کس حد تک عمل کیا جا سکتا ہے یہ ایسا مسئلہ ہے جو ہمارے اور حکومت ہند کے درمیان گفت و گو کے بعد ہی طے ہو سکتا ہے۔

"آپ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو معقول، مؤثر اور حقیقی نمائندگی دی جائے اور حکومت

کا بھی یہی مقصد ہے۔ ہمارے اور آپ کے درمیان جو فرق ہے وہ نظام کار کا ہے۔ ہم نے مخلوط انتخابی حلقوں کی سفارش کی ہے آپ کو اس سے اختلاف ہے لیکن مسلمانوں کے لیے اگر جداگانہ انتخابی حلقے بنا دیئے جائیں تو یہ ہمارے تجویز کردہ اصول کے اصل مقصد سے انحراف نہ ہوگا۔

"آپ نے یہ اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ اگر انتخابی نظام صرف تعداد پر مبنی کیا گیا تو مسلمانوں سے انتہائی بے انصافی ہوگی۔ ہم سب نے اس مسئلہ پر غور کیا ہے اور ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کے اندیشے کہاں تک حقیقی ہیں۔ اربابِ حکومت کا یہ کام ہے کہ وہ ان اندیشوں کو پیش نظر رکھیں اور ان کو دُور کریں"

مسلمانوں کا ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ مجوزہ اصلاحات کے مطابق وائسرائے کی انتظامی کونسل میں بجائے ایک کے دو ہندوستانی ممبر رکھے جائیں جن میں ایک ہندو ہو اور ایک مسلمان۔ مورلے نے اس سے اختلاف اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ وہ یہ گوارا نہ کرسکتا تھا کہ کونسل کے چھ ممبروں میں سے دو ہندوستانی ہوں۔ اس کے خیال میں ہندوستانی اس عہدہ کے حق دار نہیں تھے۔ بلکہ حکومت اپنی مہربانی سے ایک ہندوستانی کو بھی یہ عزت بخشنا چاہتی تھی، یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اہل اور قابل ہندوستانی اتنے اعلیٰ عہدہ پر بھی فائز کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ مورلے نے یہ درخواست قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

ایک اہم اجتماع

دستوری اصلاحات کے نفاذ کا وقت جوں جوں قریب آتا گیا ہندوستان اور برطانیہ میں مسلمانوں کی جد وجہد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ چنانچہ لندن مسلم لیگ نے جنوری ۱۹۱۰ء میں ایک بہت اہم اجتماع منعقد کیا جس میں لارڈ رے، لارڈ اویبری، لارڈ زٹلینڈ اور ہندوستانی مسلمانوں کے مقاصد و مطالبات سے ہمدردی رکھنے والے دوسرے کئی سربرآوردہ انگریز بھی شریک ہوئے۔ اس جلسہ کے صدر امیر علی تھے اور انھوں نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کے حقوق و مطالبات، ان کے سیاسی موقف اور اصلاحات کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کے نظام حکومت میں بہت ہی اہم دستوری تبدیلیاں ہونے والی ہیں۔ تعلیم یافتہ طبقوں کو ملک کے نظم و نسق میں زیادہ اہمیت حاصل ہو جائے گی جس سے دُور رس نتائج مترتب ہوں گے۔ مسلمان ان متوقع تبدیلیوں کو بہت اہم تصور کرتے ہیں کیونکہ

اگر وہ برطانیہ اور ہندوستان دونوں ملکوں میں حکومت اور عوام کے سامنے اپنے حقوق و مطالبات کو اچھے اور مؤثر طور پر پیش نہ کر سکے تو اس سے ان کے مفاد کو مستقل نقصان پہنچے گا۔ مسلمانوں نے اصلاحات کے اصولوں کا اس توقع پر خیر مقدم کیا ہے کہ ان کے جائز حقوق کا مناسب اور مؤثر طور پہ تحفظ کیا جائے گا اور انھوں نے کوئی ایسے مطالبات نہیں کیے جو ناجائز ہوں یا جنھیں دوسری کسی قوم کی حق تلفی کہا جا سکے بلکہ وہ صرف یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ہندوستان کے باشندوں کو جو سیاسی مراعات دی جانے والی ہیں ان میں مسلمانوں کو بھی ان کا جائز حصہ دیا جائے اور یہ حصہ خود حکومتِ ہند کے الفاظ میں " ان کی تعداد اور ان کی تاریخی اور سیاسی اہمیت کے شایانِ شان ہو۔"

مسلمانوں کی امتیازی حیثیت

" وائسرائے نے مسلمانوں کو یقین دلایا ہے کہ ہندوستان میں جو دستوری تبدیلیاں ہوں گی، ان میں ان کے سیاسی حقوق و مفادات کا تحفظ کیا جائے گا۔ مسلمانوں نے وائسرائے کی اس یقین دہانی پر ہی اپنے مطالبات مبنی کیے ہیں۔ مسلمانوں نے اپنی تاریخی اور سیاسی اہمیت کی بنا پر جو مطالبات کیے ہیں ان پر بعض جانب دار حلقے اعتراضات کر رہے ہیں ان لوگوں کے مخالفانہ حملوں کے جواب میں یہ واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً دو سو سال پہلے ایک مسلمان فرماں روا نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان کے تین امیر ترین صوبوں کا پٹہ عطا کیا تھا اور اس کے بعد جب انگریزوں کا اقتدار شمالی اور مغربی ہندوستان میں بھی پھیل گیا تب بھی مسلمان شہنشاہ تمام جائز حقوق کا سرچشمہ تھا۔

۸۳۲

ایسٹ انڈیا کمپنی نے مغل شہنشاہ کے حقوق کو تسلیم کر لیا تھا اور اپنے سکوں پر اس کا نام اور نشان تک کندہ کراتی رہی۔ بہت سے مرہٹہ سردار اور دوسرے ہندو سردار مسلمان حکمرانوں کے دیئے ہوئے خطابات پر فخر کرتے تھے اور وہ اب بھی ان کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ کہنا ایک بالکل مہمل بات ہے کہ مسلمانوں کو کوئی تاریخی اہمیت حاصل نہیں ہے۔

" ہندوستانی مسلمان اپنے مذہب، روایات اور نسل کی وجہ سے مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے باشندوں سے مربوط ہیں۔ مسلمانوں کے ان ممالک کا سلسلہ بحر اوقیانوس کے ساحل تک پھیلا ہوا ہے اور یہاں انگلستان کو حق و انصاف کا علمبردار سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو یہ توقع ہے کہ ان کی سیاسی اہمیت کے مدنظر سیاسی حقوق و مراعات میں ان کو سب سے زیادہ حصہ ملے گا

مسلمان امتیازی حیثیت کے مالک ہیں اور ہندوستان کے ان صوبوں میں بھی جہاں ان کی تعداد کم ہے ان کے بالائی طبقے مسلمہ طور پر بہت ذی حیثیت اور با اثر ہیں۔

ہندوستان کی دو بڑی قوموں میں شدید اختلاف ہے

"مسلمان یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہندوستان کی فلاح و ترقی کے لیے اس کے تمام باشندوں میں باہمی تعاون ناگزیر ہے اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ سرکاری افسروں اور عوام میں بھی خوشگوار تعلقات ہوں، اور وہ بھی آپس میں تعاون کریں لیکن وہ اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں نہیں بند کر سکتے کہ مسلمان قوم اور ہندو قوم کے درمیان زندگی کے تمام شعبوں میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ اختلاف جزئیات تک میں موجود ہے اور اس کی وجہ سے ان دونوں قوموں میں زبردست تفریق پیدا ہو گئی ہے۔

"بعض لوگ ہندوستان کی ان دو بڑی قوموں کو برطانیہ کے رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کے مماثل سمجھتے ہیں جو بالکل غلط ہے۔ ہندو اور مسلمان ایک مذہب کے دو فرقے نہیں بلکہ ان دونوں کے مذہب اور نظامِ حیات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ایک ہی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگرچہ ان کے مذہبی رسوم اور عقائد میں فرق ہے لیکن ان کا طرزِ زندگی، ان کا اندازِ فکر، ان کے قوانین، ان کے رسوم و رواج اور روایات یکساں ہیں اور ان میں کوئی ایسا فرق نہیں جو انھیں ایک دسترخوان پہ کھانے اور ایک ہی پیالے میں پانی پینے سے منع کرتا ہو۔ وہ آپس میں شادی بیاہ کر سکتے ہیں اور ایک فرقے سے نکل کر دوسرے فرقے میں شامل ہو سکتے ہیں لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کے معاملے میں حالات اس کے بالکل برعکس ہیں۔ یہ دونوں بالکل ہی متضاد نظاموں کے حامل ہیں اور ایک ہزار سال تک ایک ساتھ رہنے کے باوجود ایک دوسرے میں ضم نہ ہو سکے کیوں؟ اس لیے کہ ہندو مت محض ایک مذہب ہی نہیں بلکہ نہایت قدیم اور انتہائی پیچیدہ معاشرتی نظام بھی ہے اس کے بنائے ہوئے اصولوں اور اداروں پر ہزاروں سال سے عمل ہو رہا ہے اس قدامت کی وجہ سے انھیں مقدس سمجھا جانے لگا ہے اور ان کو ختم کرنا یا بدلنا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ اس نظام کی اساس ذات پات پر ہے اور اس کے بندھن نہایت مضبوط ہیں۔ ذات سے باہر کا کوئی شخص اس میں کبھی داخل نہیں ہو سکتا۔ یہ

سمجھنا انتہائی غلطی ہے کہ ہندومت میں کوئی جمہوری رجحان یا تصور پایا جاتا ہے۔ اس قسم کے بیرونی اثرات اس نے کبھی قبول نہیں کیے اور سب سے الگ تھلگ رہنے کی وجہ ہی سے وہ اب تک باقی بھی ہے۔ اس کے برعکس اسلام جمہوریت پسند ہے۔ اس کا رجحان اشتراکیت کی طرف ہے اور اس کے دروازے ہر آنے والے کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔

ہندو اور مسلمان ایک قوم نہیں بن سکتے

"جو لوگ ہندوستان کے حالات سے ناواقف ہیں وہ حقائق کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتے۔ اور اسی لیے وہ مشترک قومیت کی بات کرتے ہیں۔ کسی قوم کو جو تعداد میں کم ہو بڑی قوم میں شامل کرنے کا لازمی نتیجہ اختلاف اور کشمکش کی صورت میں نکلے گا۔ ہندوستان کے ایک مسلمان بادشاہ (اکبر) نے متحدہ قوم بنانے کی کوشش کی تھی مگر وہ ناکام رہا۔ اور انگریزوں کے لیے بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ اس قسم کی کوشش میں کامیاب ہو سکیں۔ مجوزہ اصلاحات اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہیں جب حکومت اس بات کا پورا خیال رکھے کہ دونوں قومیں مساوی حقوق کی مستحق ہیں۔ ملک کے نظم و نسق میں ان دونوں کی بڑی اہمیت ہے۔ دونوں قوموں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی پوری کوشش کی جائے اور کسی ایک قوم کے مفاد کو دوسری قوم کے مفاد اور اغراض کا تابع نہ بنایا جائے۔ ان ہی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمان اپنے مطالبات پر زور دے رہے ہیں۔ ان کو ہندوؤں سے نہ تو عداوت اور حسد ہے اور نہ وہ کسی کا حق مارنا چاہتے ہیں۔

"زیادہ تعداد والی قوم کو یہ جان لینا چاہیے کہ مصالحت پسندی اور رواداری سے کام لے کر وہ کم تعداد والی قوم سے خوش گوار تعلقات رکھ سکتی ہے۔ اگر اکثریت یہ سمجھ لے کہ وہ دوسروں کے حقوق پر قابض رہ سکتی ہے تو امن و امان اور ہم آہنگی پیدا ہونا ممکن نہیں اور اس طرح قومی مسائل کبھی حل نہیں ہو سکیں گے۔

قومی نمائندگی

"مسلمانوں کی نمائندگی کے مسئلے پر جو ہنگامہ آرائی ہو رہی ہے وہ بڑی حیرت انگیز ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد ان لوگوں پر مشتمل ہے جو ہندو ہونے سے انکار کرتے ہیں اور جنھیں مردم شماری کی حد تک محض آسانی کے لیے لفظِ ہندو کے زمرے میں شامل کر

کیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود یہ اصرار کیا جارہا ہے کہ ان کو ہندوؤں میں شمار کر کے ہندوؤں کی تعداد بڑھائی جائے اور پھر اسی تعداد کی بنیاد پر ہندوؤں کو نمائندگی دی جائے۔ یہ شدید بے انصافی ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یکساں اور متجانس آبادی والے ملکوں پر جن جمہوری اصولوں کا اطلاق ہوتا ہے ان کو ہندوستان پر منطبق کرنا ناممکن ہے۔ اس ملک کے پیچیدہ سیاسی مسائل کو حل کرنے کا طریقہ قومی نمائندگی ہے۔ قومی نمایندگی سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے نمائندے صرف مسلمان ہی ہوں اور ہر انتخابی نظام اور اس نظام کے ہر ایک مرحلے میں مسلمان نمائندوں کو مسلمان ہی منتخب کریں۔"

رہنماؤں میں اختلاف اور تنظیم کا خاتمہ

لندن مسلم لیگ امیر علی کی قیادت میں سرگرم عمل تھی اور دوسری طرف ہندوستان میں مسلم لیگ پر نئے رہنماؤں کا اثر بڑھتا جارہا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا اور اٹلی و ترکی میں جنگ شروع ہوگئی۔ اس کے بعد ہی بلقان میں بھی جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے اور ترکوں کو ایسے دشمن کا مقابلہ کرنا پڑا جس کو بڑی طاقتوں کی حمایت حاصل تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی دلی ہمدردیاں قدرتی طور پر ترکوں کے ساتھ تھیں اور وہ ان جنگوں کی ذمہ داری انگریزوں پر بھی عائد کرتے تھے چنانچہ ان کے خلاف جذبات میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا اور مسلم لیگی رہنما انتہا پسند پالیسی اختیار کرنے لگے۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ لندن مسلم لیگ بھی مرکزی مسلم لیگ کی اتباع اور اس کی ہدایت کے مطابق عمل کرے لیکن امیر علی کو انتہا پسند رہنماؤں سے اختلاف تھا۔ ان کو ترکوں سے غیر معمولی محبت تھی وہ ہمیشہ ان کی حمایت کرتے رہے۔ ان جنگوں میں بھی انھوں نے انجمن ہلالِ احمر قائم کر کے عربوں اور ترکوں کی بہت خدمت انجام دی تھی مگر اس بات کے خلاف تھے کہ لندن مسلم لیگ انتہا پسندی کی راہ اختیار کرے۔ یہ اختلاف اتنا بڑھ گیا کہ اکتوبر ۱۹۱۳ء میں امیر علی نے لندن مسلم لیگ کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا، ان کے ساتھ ہی نائب صدر عبداللطیف اور خازن ایس۔ ایم عتیق بھی مستعفی ہو گئے۔ دوسری طرف آغا خاں نے یہ اعلان کیا کہ ہندوستان واپس جانے کے بعد وہ بھی کل ہند مسلم لیگ سے الگ ہو جائیں گے۔ اس دوران میں مولانا محمد علی اور مسلم لیگ کے سکریٹری وزیر حسن لندن آئے تو آغا خاں نے کوشش کی کہ اختلافات دور ہو

جائیں۔ لندن مسلم لیگ کی ضرورت، امیر علی کی ذاتی اہمیت اور ہندوستان کے مختلف صوبوں بالخصوص پنجاب اور یو۔ پی میں امیر علی کی حمایت کے پیش نظر مصالحت کی کوششیں کی گئیں اور دسمبر ۱۹۱۳ء میں یہ اعلان بھی ہوا کہ امیر علی اور ان کے رفیقوں نے استعفے واپس لے لیے ہیں مگر امیر علی اس جماعت سے عملاً بے تعلق سے ہو گئے۔ کوئی اور شخص ان کی جگہ نہ لے سکا اور اس طرح لندن مسلم لیگ رفتہ رفتہ ختم ہو گئی۔

قابلِ قدر خدمات

لندن مسلم لیگ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۳ء تک سرگرم عمل رہی اور ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی اور ملی جدوجہد میں نمایاں حصہ لیا! امیر علی مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے ان کی جداگانہ سیاسی تنظیم قائم کرنا لازمی سمجھتے تھے۔ اسی نظریہ کے مطابق انھوں نے نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن اور لندن مسلم لیگ قائم کی تھی۔ اسی زمانے میں ہندوستان میں دستوری اصلاحات نافذ کرنے کا مسئلہ زیر بحث آگیا اور لندن مسلم لیگ نے مسلمانوں کے حقوق و مطالبات تسلیم کرانے کے لیے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ اصلاحات کی یہ اسکیم اس مفروضہ پر مبنی تھی کہ ہندوستان ایک ملک ہے۔ یہاں ایک قوم بستی ہے اور مغربی تصور جمہوریت کے مطابق یہاں اکثریت کے اقتدار پر مبنی نظام قائم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن امیر علی نے ان سب نظریات کی تردید کی اور یہ واضح کر دیا کہ ہندوستان ایک مصنوعی وحدت ہے اور یہ وحدت برطانوی حکومت کی بنائی ہوئی ہے۔ یہاں ایک قوم نہیں بلکہ کئی قومیں آباد ہیں مسلمان اور ہندو دو الگ قومیں ہیں اور ان کو ایک قوم بنانے کی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ مسلمان اقلیت نہیں ہیں۔ بلکہ یہ تقریباً سات کروڑ نفوس پر مشتمل ایک قوم ہیں جن کا مذہب، نظریۂ حیات، تہذیب و روایات اور رسوم و رواج سب ہندوؤں سے بالکل مختلف ہیں اور زبان، عقائد و نظریات اور قومی روایات نے ان میں قومیت کا شعور اور رشتہ مستحکم کر کے انھیں ایک متحد قوم بنا دیا ہے۔ ان کو سیاسی اور تاریخی اعتبار سے ایک امتیازی مرتبہ حاصل ہے اور اس کا تحفظ کرنا لازمی ہے اور یہ اسی طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو ایک الگ قوم تسلیم کر کے قومی حقوق دیے جائیں اور ملک کے نظامِ حکومت اور انتخابی مجالس میں ان کو ایک ممتاز قوم کی حیثیت سے نمایندگی اور جداگانہ انتخاب کا حق دیا جائے۔ مسلمانوں کے ان مطالبات کو تسلیم کرانے کے لیے ہندوستان میں کل ہند مسلم لیگ نے اور برطانیہ میں لندن مسلم لیگ نے زبردست جدوجہد کی اور آخر کار حکومتِ برطانیہ نے یہ مطالبے تسلیم کر لیے۔ یہ مطالبات درحقیقت مسلمانوں کی سیاسی بیداری کا آغاز اور ملی تحریکِ آزادی کی بنیاد تھے اور اسی بنیاد